(غلام گردش)

شام تو ہو چکی ہے!

زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کس طرح کی پر پیچ پگڈنڈیوں سے گزر کر اختتام کی طرف تیزی سے رواں دواں رہتی ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک لاجواب سوال ہے۔ حد درجہ کم ہوتا ہے کہ انسان، تھوڑی دیر ٹھہر کر بلکہ منجمد ہو کر اپنے ہی گزرے ہوئے وقت کے متعلق سنجیدگی سے سوچے۔ ویسے اس فہم کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ کون سا انسان، وقت کے کس دورانیہ میں سوچ کر سمجھے یا تو سوچے سمجھنے کی طرف مائل ہو جائے، اسکے متعلق کچھ بھی کہنا کم از کم میرے بس سے باہر ہے۔ شائد کسی کی بھی۔ آج کل طبیعت حد درجہ بوجھل سی ہو چکی ہے۔ خوشیوں اور پچھتاوا کا ایک قافلہ ہے جس میں شامل رہتا ہوں۔ تلخی کو تو ویسے ہی اپنے وجود سے باہر نکال چکا ہوں۔ دیکھا جائے تو سب کچھ انسان کے اندر ہی ہوتا ہے۔ ذہن کے اندر کا شور، باہر کے سناٹے سے حد درجہ مختلف ہے، شائد متضاد۔ جہاں دن کا اکثر اور شب کا تقریباً نصف وقت گزرتا ہے۔ وہاں اردگرد صرف کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ کبھی کبھی تو عجیب سا لگتا ہے کہ اتنی ڈھیر ساری کتابیں کس طرح جمع ہو گئیں۔ کیا واقعی میں نے جمع کی ہیں۔ عادت ہے کہ ہر کتاب کے شروع میں خریدنے کی جگہ اور تاریخ اور مقام لکھتا ہوں۔ اپنی تحریر دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ تمام کتابیں وقت کے ساتھ ساتھ میرے قافلے ہی میں شریک رہی ہیں۔ ویسے کتابیں پڑھنے کو بھی کم طبیعت مائل ہوتی ہے۔ ٹی وی کے اُکتا دینے والے پروگرام بھی حد درجہ گراں لگتے ہیں۔ چیختے چنگھاڑتے لوگ لاحاصل بحث میں وقت ضائع کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی بحث کا کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ اخبارات میں بھی وہی سنسناہٹ اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ ایک نظر ڈالیں اور معاملہ ختم۔ کبھی کبھی کوئی عمدہ کالم نظر آتا ہے تو دل میں ہلکی سے خوشی عود کر آتی ہے۔ ہاں، اپنے کتابوں والے کمرے میں ایک سپیکر ضرور رکھا ہوا ہے۔ یہ کوئی تین برس پہلے کراچی سے منگوایا تھا۔ دونوں بیٹوں یعنی مبارز و رحمزہ نے بتایا تھا کہ اب میوزک سسٹم متروک ہو چکے ہیں۔ بلیوٹوتھ سے منسلک سپیکر کا دور ہے۔ بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ دونوں بیٹوں نے خاصی تحقیق کر کے کراچی سے ایک نمایاں کمپنی کا میوزک سپیکر منگوا کر دیا تھا۔ پہلے تو مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اس پر موسیقی کیسے سنتے ہیں۔ بڑے بیٹے نے میرے پرانے سے موبائل فون سے سپیکر کو منسلک کیا۔ یہ Bose کمپنی کا بنا ہوا ہے۔ جب غزلوں، ٹھمریوں اور قوالیوں کی اعلیٰ درجہ کی آواز سنی تو مہیب میوزک سسٹم فراموش ہو گئے۔ اب ہوتا یوں ہے کہ کسی بھی وقت، بیگم اختر، فیض آبادی کو سننا شروع کر دیتا ہوں۔ صاحبان! کیا آواز ہے۔ کمال حد کمال۔ بالکل اسی طرح کے ایل سہگل کو سنتا ہوں۔ یہ لوگ جادوئی فنکار تھے۔ پتہ نہیں اتنی خوبصورت آوازوں کے مالک کیسے بن گئے یا بنا دیے گئے۔ لگتا یہی ہے کہ آواز صرف اور صرف قدرت کا نایاب عطیہ ہے۔

ہاں، ایک بات لکھنا بھول گیا۔ قرآن پاک کو ترجمہ کے ساتھ دوبار یا شائد تیسری بار پڑھنا شروع کیا ہے۔ ترجمہ پڑھنے کے بعد اس پر غور کرتا ہوں۔ ایسے ایسے سوالات ذہن میں آتے ہیں کہ خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ پہلے پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ان سوالوں کو ذہن میں مقید رہنے دوں یا کسی سے پوچھوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس سے سوالات کروں، وہ ہی ناراض ہو جائے۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ایک ایسا نام خدا نے ذہن میں ڈالا کہ گرہیں کھلنے لگیں۔ ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب کا۔ حالیہ دور سے منسلک

حددرجہ پڑھے لکھے عالم دین۔مشرقی اقدار سے بھرپوراور مغربی دنیا سے استفادہ حاصل کیے ہوئے بڑے عالم۔اتفاق سے انکا واٹس ایپ نمبر موجود تھا۔ڈرتے ڈرتے پیغام بھیجا کہ سرفکر کے ایک پُل پر تنہا کھڑا ہوں۔قرآن کا عام سا طالبعلم ہوں۔سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔خیال تھا کہ انکا جواب نہیں آئیگا۔حددرجہ مصروف انسان بھلا کیسے ایک بکھرے ہوئے انسان سے منسلک ہوگا۔مگر ڈاکٹر صاحب کا جواب آیا کہ پوچھیے۔ہمت کر کے صرف ایک سوال میسج کے ذریعے بجھوادیا۔تقریباً دس گھنٹے کی خاموشی رہی۔ذہن میں بار بار آرہا تھا کہ کیا کوئی غلطی تو نہیں کردی۔کیا ڈاکٹر صاحب ناراض تو نہیں ہوگئے۔مگر پھر ڈاکٹر صاحب کی جانب سے ایک دلفریب اور مدلل جواب آیا۔بخدا،انہوں نے فکر کا ایک روشن راستہ کھول دیا۔صرف ایک چھوٹی سی بات عرض کرونگا۔کہنے لگے،کہ ہدایت کا یہ سرچشمہ حددرجہ سنجیدہ ہے۔یہ ہدایت Casual طرزِ زندگی کے افراد کیلئے نمایاں نہیں ہے۔یقین کی منزل پر وارفتگی سے چلنے والے ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔سب کچھ تو عرض نہیں کرسکتا۔جواب سنکر جب قرآن اور ترجمہ پڑھنا شروع کیا تو ذہن میں ایک بھرپور پسِ منظر تھا۔خدا،ڈاکٹر خالد ظہیر جیسے عالم کو صحت اور عزت سے زندہ رکھے۔کمال کا شخص ہے کمال کا۔

سٹڈی میں دل خوب لگتا ہے۔کچھ وقت تنہائی کا میسر آتا ہے اور یہی حاصلِ دن ہوتا ہے۔چند لمحے اپنے ساتھ گزرانے کا نادر موقعہ میسر آتا ہے۔کتاب،موسیقی اور تنہائی حددرجہ عظیم ساتھی ہیں۔دراصل خاموشی کی زبان سب سے طاقتور ہے۔اور تنہائی بہت قیمتی مددگار ہے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان اپنی عملی زندگی میں کیا کیا جتن کرتا ہے۔آگے بڑھنے کیلئے ہردم کوشاں رہتا ہے۔مگر یہ لامتناہی عمل نہیں ہے۔بلکہ انتہائی قلیل مدت کا ہے۔عملی زندگی ایک پَل کی طرح گزر جاتی ہے۔عجیب بات یہ بھی ہے کہ اکثر دوست کہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد انسان کے سماجی رابطے حددرجہ کم ہوجاتے ہیں۔ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہی نہیں ہے۔مگر میں نے اس سے حددرجہ مختلف امکانات پائے ہیں۔حلقہ میں دوست ہردم ساتھ رہتے ہیں۔سماجی روابط تو خیر پہلے سے بہت بہتر ہوگئے ہیں۔مسلسل کسی نہ کسی طور پر میل جول جاری رہتا ہے۔اصل بات تو یہ ہے کہ فرصت کم میسر آتی ہے اور اکیلا رہنا میرے لیے ایک خزانے سے کم نہیں رہا۔اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو میری عمر کے لوگ یکسر زندگی میں دلچسپی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔اکثریت کی گزارش کررہا ہوں۔مگر آج بھی میں زندگی میں ہرتنوع کو محسوس کرتا ہوں۔زندگی کی کئی گھتیاں تو ویسے ہی سنجیدہ عمر میں کھلنی شروع ہوتی ہیں۔وقت کی بھیڑ میں تو خیر انکے متعلق ادراک ہی کم ہوتا ہے۔ایک بات پر ضرور عمل کرتا ہوں۔سرکاری دفاتر میں با اَمر مجبوری میں فون کرتا ہوں۔بابوؤں سے بات کرنے سے حددرجہ اجتناب کرتا ہوں۔اسلیے بھی کہ عمل اور ردِعمل کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔

منیر نیازی صاحب ایک دن پتہ نہیں کیوں،مجھے کہنے لگے کہ ڈاکٹر،ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جس پر پوری زندگی عمل کرتا رہا ہوں۔یہ نکتہ دلچسپی کا باعث تھا۔نیازی صاحب کہنے لگے کہ پوری عمر کبھی بھی،کسی بھی صورتحال میں ردِعمل کا شکار نہ ہونا۔اگر یہ کروگے تو زندگی دکھی ہوجائیگی۔تیس برس پہلے مجھے یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔مگر اب پلے پڑی ہے۔ہم اپنے ذاتی سکون کو اسلیے بھی برباد کرلیتے ہیں کہ فلاں حرکت یا گفتگو یا جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی۔یہ ردِعمل کا حصہ ہے۔اس تالاب میں اگر ایک بار کود پڑے،تو غیر متوقع طور پر دکھ اور اندرونی غم کے چھینٹے آپکو شرابور کردینگے۔جب سے ردِعمل کا احساس ذہن سے کھرچ کر نکال

دیا ہے، زندگی حد درجہ پُرسکون ہوگئی ہے۔ سرکاری بابوؤں سے کوئی کام ہی نہیں پڑتا۔ لہذا کس طرح کا رابطہ۔ مگر کبھی کبھی کسی مظلوم انسان کی فریاد آگے پہنچانی ہو تو ضرور ارباب اختیار سے بات کرتا ہوں۔ ابھی تک اپنے اندر سے عام لوگوں کی مدد کے عنصر کو عنقا نہیں کر پایا۔ آپ کبھی ردِعمل کو اپنے اندر سے کھرچن کی طرح باہر نکال ڈالیں۔ تو قیاس نہیں، یقین سے، زندگی بہتر ہو جائیگی۔

ایک عرض ضرور کرونگا۔ پچیس برس سرکار کی اعلیٰ ترین نوکری کرنے کے بعد یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ افسران، ذاتی سطح پر لوگوں کے مسائل حل کرنے کیلئے ہر دم تیار تو رہتے ہیں۔ مگر تہتر سال سے سیاستدان اور سرکاری افسران مجموعی طور پر عام لوگوں کی زندگی کو آسان تر نہیں کر پائے۔ اقتدار کسی بھی شخص کے پاس ہو، وہ عسکری ادارے کا سربراہ ہو یا ووٹوں سے تخت نشین ہوا ہو، کوئی بھی صاحبِ اقتدار حکمران عام لوگوں کے جزوی مسائل تک حل نہیں کر پایا۔ یہ نہیں کہ ان مقتدر لوگوں میں اچھے انسان نہیں۔ چند شاندار انسان بھی ہیں۔ مگر ایک ایسی مثبت تبدیلی جیسے جاپان، ساؤتھ کوریا، یو اے ای یا چین میں برپا ہوئی ہے۔ اس میں ہم مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں۔ یہ ایسا قومی المیہ ہے جس نے ہمارے ہر شہری کو مصلوب کیا ہے۔ قیامت یہ بھی ہے کہ ہمارا ہر قومی ادارہ اپنے بوجھ کے نیچے خود ٹوٹ چکا ہے۔ شائد قیادت کا فقدان ہے یا بوجھل نظام کا منفی کمال، کہ مجموعی طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ بہت کم ایسے افراد اُٹھ کر سامنے آتے ہیں جن سے اچھائی اور بہتری کی خوشبو اُمڈتی ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ قومی سطح پر ناکامی کے باوجود کیا انسان انفرادی سطح پر کامیاب ہونے کیلئے محنت کرنا چھوڑ دے۔ ہرگز نہیں۔ اردگرد ذاتی کامیابیاں حاصل کرنے والے لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی میں ہر لحاظ سے انفرادیت حاصل کی۔ بے مثال مادی اور ذہنی ترقی کی۔ اپنے آپکو روشن مثال بنا کر پیش کیا۔ ہاں ایسے لاجواب لوگ بھی موجود ہیں، جو حد درجہ دولت حاصل کرنے کے باوجود خاموشی سے سفید پوش لوگوں کی مشکلات حل کرتے ہیں۔ ذاتی اور اجتماعی ترقی کے اس تضاد کو نہ میں سمجھ سکا ہوں اور نہ حل کر پایا ہوں۔ اب تو یہ احساس راسخ ہے کہ جو عقدہ حل نہیں ہوتا، اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

سوچتا یہ بھی ہوں کہ سرکاری زندگی میں اپنے آپکو عام آدمی کی بہتری کیلئے ہر ممکن مصروف رکھا۔ مگر پھر بھی اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی لانے میں معاونت برپا نہیں کر پایا۔ جیسا ملک موجود تھا اور انشاء اللہ ہے، اس میں عام انسان کی مشکلات میں بھرپور کمی نہیں کر پایا۔ شائد ایک عام سا بابو تھا۔ فرق صرف یہ کہ ہر وقت دروازے کھلے رکھتا تھا۔ بہرحال اس بات کا ادراک ہے کہ اپنے حصہ کا کام اچھے طور پر کرنے کی عملی کوشش ضرور کی ہے۔ حساب تو اپنے اپنے عمل ہی کا ہے۔ مگر سوچ ذہن میں ضرور آتی ہے کہ ہمارا ملک، عظیم تر کامیابی کیوں حاصل نہیں کر پایا۔ ہم ذہنی، اقتصادی، سماجی طور پر اتنے پسماندہ کیوں ہیں۔ اب سوال کرنا بھی ترک کرنا چاہتا ہوں۔ اسلیے کہ زندگی کی شام ہو چکی ہے۔ وقت کا سورج تو ڈھل چکا ہے۔ اب تو اندھیرا ہونے کو آ چکا ہے۔ لہذا، کیسی پریشانی اور کیسا دکھ!

راؤ منظر حیات